

راشد کی سامراج دشمنی

پروفیسر فتح محمد ملک

In this article, Professor Fateh Mohammad Malik informs the reader about Rashed's political vision and his analytical understanding of political events as an essential theme in his poetry. Rashed's involvement, concern and denunciation of hegemonic forces in the Asian region is highlighted.

نظموں میں جو تجربہ بیان ہوا ہے وہ انتہائی ذاتی اور خود شاعر کی روح میں پیوست ہے ان نظموں کے متکلم کو افسانے کا واحد متکلم نہیں کہا جاسکتا۔ انم راشد کے ہاں ایسی نظموں کی کمی نہیں جو انتہائی ذاتی نظمیں ہیں۔ انھیں محض خود نوشت کے انداز کی نظمیں کہہ کر ٹالنا ممکن نہیں ہے۔ خود نوشت میں تو انسان اپنے پڑھنے والے، یا ماحول، یا مصلحت کا خیال کر کے کچھ جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔ یہ نظمیں سراسر سچے دل سے محسوس کی گئی اور بیان کی گئی نظمیں ہیں۔

رواں صدی کی تیسری دہائی میں ہمارے ادبی افق پر شاعروں کی جو نئی نسل نمودار ہوئی تھی اُس میں انم راشد کی شاعری سب سے زیادہ زور دار رزمیہ آہنگ رکھتی ہے۔ وہ اقبال کے بعد ممتاز و منفرد مقام حاصل کرنے والے شاعروں میں سب سے بڑے سامراج دشمن دانشور ہیں۔ فکرو فن کی تدریجی نشوونما کے پہلے دور میں اگر ان کے ہاں سامراج دشمنی کے بلند آہنگ ہے تو آخری دور میں زیر لب، مگر از اول تا آخر ان کی شاعری سامراجی اور نوآبادیاتی یلغار کے خلاف شمشیر برہنہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اردو تنقید نے اکثر و بیشتر، راشد کی شاعری میں جنس اور جسمانییت کی تحسین و تردید ہی سے سروکار رکھا ہے۔ اس ضمن میں فرائیڈین سکول تو خیر اپنی افق و طبع سے مجبور تھا مگر ادب کو انقلاب کا نقیب گرداننے کے خوگر مارکسی نقاد بھی راشد کی شاعری پر فحش نگاری اور فراریت پسندی کی تہمتیں دھرنے میں پیش پیش رہے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ راشد ہر نوع کے سامراج کے جانی دشمن ہیں۔ وہ مغربی سامراج کے ساتھ ساتھ سوویت سامراج اور ابھرتے ہوئے برہمن سامراج سے بھی شدید نفرت کرتے ہیں۔ راولپنڈی سازش

retaining its own independent government under the young Shah. The occupying powers subordinated everything to the economic and political objectives of supplying the eastern front and winning the war, with disastrous results for Iran's small economy. The worst of the results was widespread famine, especially in 1942-1943, triggered by a poor harvest the previous year. Corruption, incompetence and arrogance characterized almost anyone in authority, in national and local government, the army and the police. The influence of the occupying powers had a Christian-religious extension in the south, and a communist- ideological extension in the north, both of which were socially disruptive." (1)

یہ تھی وہ سنگین صورت حال جس میں ن م راشد برطانوی قابض فوج کے ایک محکوم افسر کے طور پر مقبوضہ ایران میں وارد ہوئے تھے۔ چنانچہ اُن کے سلسلہ منظومات بعنوان ”ایران میں اجنبی“ کا آغاز برطانوی سامراج کے ایک کارندے کی حیثیت میں ایران میں اپنی موجودگی پر معذرت سے ہوتا ہے:

”ہم اس کے مجرم نہیں ہیں، جانِ عجم نہیں ہیں
وہ پہلا انگریز

جس نے ہندوستان کے ساحل پہ

لا کے رکھی تھی جنسِ سوداگری

یہ اس کا گناہ ہے

جو ترے وطن کی

زمینِ گل پوش کو

ہم اپنے سیاہ قدموں سے روندتے ہیں!

اپنی بندگی و بے چارگی کے اس اعتراف کے پیرائے میں راشد اپنی مخاطب کو درد

کیس میں ملوث ہو کر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے والے ”انقلابیوں“ کے ساتھ تمام تر ہم دردی کے باوجود وہ بڑی دل سوزی کے ساتھ اپنے اشتراکی دوست کو سوویٹ استعمار کی غارت گری سے یوں خبردار کرتے ہیں:

..... مگر تو نے دیکھا بھی تھا

دیوتا تار کا حجرہ تار

جس کی طرف تو اُسے کر رہا تھا اشارے

جہاں بام و دیوار میں کوئی روزن نہیں ہے

جہاں چار سُو باد و طوفاں کے مارے ہوئے راگیروں

کے بے انتہا استخوان ایسے بکھرے پڑے ہیں

ابد تک نہ آنکھوں میں آنسو، نہ لب پہ فغاں!

(انقلابی)

یہ بات معنی خیز ہے کہ راشد کے ہاں اشتراکی روس کا تصور ہمیشہ ایک ایسے تاریک زنداں کی صورت میں ابھرتا ہے جس میں وسط ایشیا کے مسلمان مجبوس ہیں۔ راشد صاحب کو ایران میں اپنے قیام کے دوران ایشیا میں مغربی سامراج کے ساتھ ساتھ روسی سامراج کے پھیلتے ہوئے اثرات کا جیتا جاگتا مشاہدہ کرنے اور مغرب اور روس ہر دو کے باہم متضادم سامراجی عزائم کا سچا ادراک حاصل کرنے کا موقع ملا تھا۔ وہ ۱۹۴۳ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک برٹش انڈین آری کے انٹرسر و سز پبلک ریلیشنز آفیسر کی حیثیت میں کام کرتے رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایران کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی میں برطانوی اور روسی سامراجی قوتوں کی باہمی آویزش زوروں پر تھی۔ پروفیسر برائن سپونر نے سیمین دانشور کے ایک ناول پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اُس زمانے کے ایران کا ذکر درج ذیل الفاظ میں کیا ہے:

"From 1941 to 1945 Iran was reduced to the most abject state of dependence of its modern history, while still nominally

مشترک سے پیدا ہونے والی اس کرناک صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہیں اور ہر دو قوموں پر مسلط سامراجی قوتوں سے نجات ایک سامراج دشمن ایشیائی اتحاد میں دیکھتے ہیں۔ چنانچہ نظم سامراج کی ”آہنی کمندِ عظیم“ کو عکبوت کے جال کی مانند توڑ کر رکھ دینے کی تمنا پر آتمام ہوتی ہے:

بس ایک زنجیر،

ایک ہی آہنی کمندِ عظیم

پھیلی ہوئی ہے،

مشرق کے اک کنارے سے دوسرے تک،

مرے وطن سے ترے وطن تک،

بس ایک ہی عکبوت کا جال ہے کہ جس میں

ہم ایشیائی اسیر ہو کر تڑپ رہے ہیں!

تڑپ رہے ہیں

بس ایک ہی دردِ دلاو میں،

اور اپنے آلامِ جاں گزا کے

اس اشتراکِ گراں بہانے بھی

ہم کو اک دوسرے سے اب تک

قریب ہونے نہیں دیا ہے!

(من و سلوی)

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایران میں اپنے قیام کے دوران راشد اپنی ذاتی اور اپنی قومی و ملی زندگی پر سامراج کی غلامی کے اثرات پر ہر آن بڑی دل سوزی کے ساتھ تخلیقی غور و فکر میں

مصروف رہے ہوں۔ وہ اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں مصروف ہوں یا سیر و تماشا میں مشغول، محکوم ایشیا کے مصائب اُن کے دل و دماغ کو ہر آن اپنی گرفت میں رکھتے ہیں۔ اس کی ایک مثال اُن کی نظم ”تماشا گہ لالہ زار“ ہے۔ بظاہر وہ تہران کے لالہ زار سینما میں تھیٹر دیکھ رہے ہیں مگر اُن کا دل کچھ اور طرح کے سوالات میں منہمک ہے:

تماشا گہ لالہ زار،

”تیا تر“ یہ میری نگاہیں جی تھیں

مرے کان ”موزیک“ کے زیر و بم پر لگے تھے،

مگر میرا دل، پھر بھی کرتا رہا تھا

عرب اور عجم کے غموں کا شمار

تماشا گہ لالہ زار!

نظم ایران کے ماضی کی شان و شوکت کے لٹ کر رہ جانے اور اپنی قدیم تہذیب کے زوال کی نوہ خوانی پر غور و فکر کرتے ہوئے نئے آدمی کے خواب پر ختم ہوتی ہے:

تماشا گہ لالہ زار،

عروسِ جوان سالِ فردا، حجابوں میں مستور

گر سنہ نگہ، زود کاروں سے رنجور

مگر اب ہمارے نئے خواب کا بوسِ ماضی نہیں ہیں،

ہمارے نئے خواب ہیں، آدمِ نو کے خواب

جہانِ تنگ و دو کے خواب!

جہانِ تنگ و دو، مدائنِ نہیں،

کارِ بغفور و کسری نہیں

یہ اُس آدمِ نو کا مادی نہیں

نئی بستیاں اور نئے شہریار

تماشا گہ لالہ زارا!

(تماشا گہ لالہ زارا!)

راشد کی متعدد نظموں کی طرح یہ نظم بھی اقبال کی شاعری کو آواز دیتی سنا دیتی ہے۔
نظم کا آخری بند پڑھتے وقت اقبال کا درج ذیل شعر دل و دماغ میں گونجنے لگتا ہے:

کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد

مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

جہاں تک سامراجی حکمت عملی کے عیاں اور پنہاں ہتھکنڈوں کو بے نقاب کرنے کا
تعلق ہے، اسی سلسلہ منظومات کی نظم 'تیل' کے سوداگر ہماری جدید اور ترقی پسند شاعری میں اپنی
مثال آپ ہے۔ اس طویل نظم کا پہلا مصرع: "بخارا سمرقند اک خال ہندو کے بدلے" ہی حافظ
سے لے کر اقبال تک ہماری تہذیبی اور شعری روایت کو ہمارے دل و دماغ میں زندہ کر دیتا ہے۔
اقبال نے بھی کچھ ایسی ہی حسرت کے ساتھ حافظ کے زبان زد عام شعر کے تناظر میں کہا تھا:

بدست مانہ سمرقند و نے بخارا بی ست

دعا گو ز فقیراں بہ ترک شیرازی

اقبال کی طرح راشد کے ہاں بھی بخارا اور سمرقند فقط دو شہروں کے نام نہیں بلکہ ایک
خاص قومی و ملی طرز احساس کے استعارے ہیں۔ راشد صاحب نے یہ نظم آج سے ساٹھ برس
پیشتر جنگ عظیم دوم کے زمانے میں کہی تھی۔ جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے اس زمانے کا ایران مغربی
اور روسی فوجوں کے قبضہ میں تھا۔ اس نظم کا پس منظر سامراجی تسلط کے ستم سہتی ہوئی ایرانی زندگی
ہے۔ نظم کا فوری محرک ایران پر اشتراک کی روس کے ساتھ تیل کی تلاش کے ایک معاہدے پر رضامند
ہو جانے کے لئے سامراجی دباؤ ہے۔ راشد اہل ایران کو سامراجی حکمت عملی کے بھیانک نتائج کی
جانب متوجہ کرتے وقت سنٹرل ایشیا پر اشتراک کی تسلط کے احوال و مقامات کی جانب انتہائی خیال

انگیز طنزیہ اشارے کرتے ہیں۔ نظم بخارا اور سمرقند کی یاد سے شروع ہوتی ہے:

بخارا سمرقند اک خال ہندو کے بدلے!

بجا ہے، بخارا سمرقند باقی کہاں ہیں؟

بخارا سمرقند نیندوں میں مدہوش،

اک نیلگوں خامشی کے جبابوں میں مستور

اور رہروں کے لیے ان کے در بند،

سوئی ہوئی مہ جبینوں کی پلکوں کے مانند

روسی "ہما دوست" کے تازیانوں سے معذور

دومہ جبینیں!

حافظ کے زبان زد عام شعر کے حوالے سے سمرقند و بخارا کو مسلمانوں کی تہذیبی بالادستی
کی دو علامتوں کے طور پر استعمال کر کے شاعر نے مسلمانوں کی موجودہ تہذیبی غلامی کی جو تصویر
پیش کی ہے، وہ تہذیبی زوال اور سیاسی استبداد کے المیہ کو اپنی تمام تر سفاکی کے ساتھ اُجاگر کرتی
ہے۔ نظم کے دوسرے بند میں سمرقند و بخارا زوال اور استبداد کے تاریخی پس منظر میں عصری زندگی
کے لئے درس عبرت بن جاتے ہیں:

بخارا سمرقند کو بھول جاؤ

اب اپنے درخشنده شہروں کی

تہران و مشهد کے سقف و درو بام کی فکر کرلو،

تم اپنے نئے دور ہوش و عمل کے دل آویز چشموں کو

اپنی نئی آرزوؤں کے ان خوبصورت کنایوں کو

محفوظ کرلو!

ان اونچے درخشنده شہروں کی

آزادی اور خود مختاری سلب کر کے اور ان کا قومی شیرازہ بکھیر کر کس طرح چپکے ہی چپکے ان کو چلتی پھرتی زندہ لاشوں میں بدل دیتے ہیں؟ رات کی ناچتی گاتی، پیتی پلاتی ضیافت کی بساط جب صبح دم الٹی جائے گی تب کھلے گا کہ وہ تو مر چکے ہیں۔ برطانوی سامراج کے چنگل میں تڑپتا ہوا شاعر اپنے ایرانی بھائیوں کو اپنے تجربات سے پھوٹی ہوئی روشنی میں روسی سامراج کی خونخوار تمناؤں کو سمجھنے اور ان کی دستبرد سے بچ نکلنے کی راہ بھاتا ہے:

بہائے ہیں ہم نے بھی آنسو،
ہماری نگاہوں نے دیکھے ہیں
سیال سایوں کے مانند گھلتے ہوئے شہر
گرتے ہوئے بام دور
اور مینار و گنبد

ہمارے برہنہ و کاہیدہ جسموں نے
وہ قید و بند اور وہ تازیانے سہے ہیں
کہ ان سے ہمارا شکر
خود اپنے الاؤ میں چلنے لگا ہے

راشد کے نزدیک اس مردہ، غلام زندگی سے نجات کا راستہ موجود ہے۔ زندگی کو جاتا ہوا یہ راستہ ایشیائی اتحاد عمل کا راستہ ہے۔ اپنے تہذیبی اشتراک کی بنیاد پر اپنے مشترکہ ستم گروں کے خلاف مزاحمت کا راستہ۔ چنانچہ شاعر اپنے ایرانی بھائیوں کو اتحاد فکر و عمل کے لئے پکارتا ہے:

مرے ہاتھ میں ہاتھ دے دو!
مرے ہاتھ میں ہاتھ دے دو!
کہ دیکھی ہیں میں نے
ہمالہ والوں کی چوٹیوں پر، انا کی شعاعیں،

کوئی فصیلوں کو مضبوط کر لو
ہر اک برج و بارو پر اپنے نگہباز چڑھا دو،
گھروں میں ہوا کے سوا
سب صداؤں کی شمعیں بجھا دو!
کہ باہر فصیلوں کے نیچے
کئی دن سے رہزن ہیں خیمہ لگن،
تیل کے بوڑھے سودا گروں کے لبادے پہن کر،
وہ کل رات یا آج کی رات کی تیرگی میں،
چلے آئیں گے بن کے مہماں
تمہارے گھروں میں
وہ دعوت کی شب جام و مینالڈھائیں گے
ناچیں گے، گائیں گے،
بے ساختہ تہتہوں، ہمہوں سے
وہ گرمائیں گے خون محفل
مگر پو پھٹے گی
تو پلکوں سے کھودو گے خود اپنے مردوں کی قبریں
بساط ضیافت کی خاکستر سوختہ کے کنارے
بہاؤ گے آنسو!

تیل کے سودا گروں کے بھیس میں دوستی کے لبادے پہن کر آنے والے مہمانوں کی سامراجی حکمت عملی اور طرز عمل کو شاعر نے گہری سیاسی بصیرت کے ساتھ نمایاں کیا ہے۔ یہ مہمان اپنے میزبان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے اصل روح حیات کو کس طرح فنا کر دیتے ہیں؟

انہی سے وہ خورشید پھوٹے گا آخر

بخارا سمرقند بھی سالہا سال سے

جس کی حسرت کے در یوزہ گر ہیں۔

یہاں یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ ہمالہ والوں کی چوٹیوں پر انا کی جن شعاعوں کی جانب
راشد ہمیں متوجہ کر رہے ہیں وہ اقبال کی انقلابی فکر سے پھوٹی ہیں:

رابط و ضبط ملت بیضا ہے مشرق کی نجات

ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر

واقعاً مشرق کی نجات مسلمان ممالک کے ربط باہم میں پوشیدہ ہے۔ اس حقیقت کو
سامراجی قوتوں نے بھی خوب سمجھا ہے۔ چنانچہ یہ سامراجی قوتیں مسلمانوں کے ربط باہم کو توڑنے
اور یوں پورے مشرق کو اپنے ریوٹ کنٹرول میں رکھنے کی حکمت عملی پر عمل پیرا ہیں۔ ن م راشد
نے اقبال کی نقالی کی بجائے اپنے عصری تناظر میں فکر اقبال سے تخلیقی اکتساب کا شیوہ اپنایا ہے۔

تاریخ نے دیکھا کہ راشد کا دکھایا ہوا راستہ بالآخر کامیابی کی کلید ثابت ہوا۔ سوویت
روس کے اشتراکی سامراج کے خلاف عوامی جدوجہد کا راستہ ہی بخارا و سمرقند یعنی سنٹرل ایشیا کی
آزادی کا صراطِ مستقیم ثابت ہوا۔ آج پورا ایشیا مغربی سامراج کے براہ راست تسلط سے آزاد
ہے مگر آج ایک بار پھر امریکی، یورپی اور روسی استعمار یک جان اور سہ قالب بن کر ایشیا کو پھر سے
اسے اپنے نوآبادیاتی جال میں پھنسانے میں کوشاں ہیں۔ اقبال کے بعد راشد ہمارے وہ تنہا
شاعر ہیں جنہوں نے برطانوی سامراج کی پسپائی کے آغاز ہی میں یہ راز پالیا تھا کہ پسپا ہوتے
ہوئے برطانوی سامراج نے برٹش انڈیا میں اپنے جانشین سامراج کی ساخت پر داخت شروع کر
دی ہے۔ اس حقیقت کا پہلا بھرپور عکس راشد کی نظم 'سومنات' میں جلوہ گر ہے۔

اگر 'سومنات' کی سی عہد آفرین تخلیق آج تک ہم نقادوں کی توجہ سے محروم چلی آ رہی
ہے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ اس لئے کہ راشد نے برطانوی ہند میں آزادی کی تحریک کو

اپنے فکر و فن کے آئینے میں منعکس کرتے وقت اپنے زمانے کے سکہ بند اشتراکی اور سرمایہ دارانہ
تصورات فن کو کلاماً رد کر دیا ہے۔ ہر چند وہ برصغیر میں بسنے والی تمام قوموں کی آزادی کے تمنائی
ہیں مگر ان کی تخلیقی شخصیت کا بنیادی بیج و تاب اُن کی اپنی مسلمان قوم اور اس کی ہم نصیب اچھوت
قوم کے مصائب سے پھوٹ رہا ہے۔ راشد کی فکر حیرت انگیز پیش بینی کے ساتھ اپنے عہد کے
مقبول عام انقلابی سیاسی نعروں میں الجھ کر رہ جانے کی بجائے اس حقیقت کی تہ تک پہنچ گئی ہے کہ
پسپا ہوتا ہوا فرنگی سامراج ہندوستان میں ایک نئے برہمنی سامراج کو اپنا جانشین بنانے میں سرگرم
عمل ہے۔ چنانچہ "برہہ فروش افرنگ" برہمنیت کے دیو استبداد کو آزادی کی نیلم پری بنا کر پیش
کرنے میں کوشاں ہے۔ "عجوزہ سومنات" اس نئے سامراج کا بڑا بلیغ استعارہ ہے۔ نظم صدیوں
پر پھیلی ہوئی ہندو مسلم کش مکش کو ڈرامائی انداز میں فوکس میں لاتی ہے۔ فرنگی اس کشمکش کو ایک نیا
عصری روپ دینے میں مصروف ہے۔

میں جب بھی بھارت اور امریکہ کی فوجی یگانگت اور سیاسی یکجہتی کے باب میں کوئی نئی
خبر پڑھتا ہوں تو مجھے بے ساختہ ن م راشد مرحوم کی پرانی نظم 'سومنات' یاد آ جاتی ہے۔ ساٹھ برس
پرانی یہ نظم اُس زمانے کی یادگار ہے جب برصغیر میں انگریزوں کے خلاف آزادی کی تحریکیں
زوروں پر تھیں۔ اس نظم میں پیش کیے گئے صداقت پسندانہ تجزیے کی رو سے فرنگی سامراج جاتے
جاتے متحدہ ہندوستانی قومیت کے نام پر ایک ایسے نئے سامراج کی داغ بیل ڈالنے میں کوشاں
ہے جو برصغیر کی تمام قوموں کو اپنے جال میں اسیر کر کے برطانوی سامراج کی جانشینی کا حق ادا کر
سکے۔ ایسے میں راشد کی امیدیں مسلمان قوم سے وابستہ ہیں اور وہ سوچ رہے ہیں کہ مسلمان اپنی
جداگانہ قومی ہستی کے اثبات سے اس نئی سامراجی سازش کا پردہ چاک کر ڈالیں گے۔ ہندی
مسلمان راشد کی توقعات پر پورا اترے اور قیام پاکستان سے انھوں نے برصغیر کی دیگر اقوام کے
سامنے آزادی و خود مختاری کی راہیں روشن کر دیں۔

راشد نے نظم 'سومنات' ہندوستان میں برپا سیاسی ہنگاموں سے دُور بیٹھ کر لکھی ہے۔ یہ
وہ زمانہ ہے جب وہ برٹش انڈین آرمی کے شعبہ تعلقات عامہ میں کیپٹن راشد کی حیثیت میں

تہران، بصرہ، بغداد، قاہرہ اور کولمبو میں فرائض منصبی ادا کرنے کے ساتھ ساتھ عرب اور عجم کے غموں کا شمار کرنے میں مصروف تھے۔ ۱۹۴۳ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کے اس وقفہ زماں میں اگر ایک طرف راشد نے ہندوستان میں آزادی کی تحریک کا بے لاگ اور سفاک تجزیہ کیا ہے تو دوسری طرف وہ فرنگی استعمار کے عزائم کو بھی بے نقاب دیکھ پائے ہیں۔ دوران جنگ کی مسافرت اور کرائے کے سپاہی کی ذلت بھری زندگی کے تجربات نے اُن کے سیاسی شعور کو ایک نئی انقلابی دھار بخشی اور وہ مسلمانوں کی قومی جدوجہد کو مشرق کی نجات کا مرحلہ اول سمجھنے لگے۔ جذباتی سیاسی نعروں میں اُلجھ کر رہ جانے کی بجائے راشد کی فکر اس حقیقت کی تک پہنچ گئی ہے کہ پسپا ہوتا ہوا فرنگی سامراج ہندوستان میں ایک نئے برہمنی سامراج کو اپنا جانشین بنانے میں سرگرم کار ہے۔

نئے سرے سے غضب کی بج کر

عجوزہ سومنات نکلی

مگر ستم پیشہ غرنوی

اپنے جملہ خاک میں ہے خنداں!

اور اب فرنگی یہ کہہ رہا ہے:

کہ ”آؤ اس پڈیوں کے ڈھانچے کو

جس کے مالک تمھی ہو

ہم مل کے نورِ کخواب سے سچائیں“

فرنگی یہ جاننے کے باوجود کہ ایسا کوئی جادو کہیں بھی دستیاب نہیں جو اس بڑھیا کے عیوب کو محاسن بنا کر پیش کر سکے، تماشاخیوں کی آنکھوں کو خیرہ کرنے میں مصروف ہے۔ کاروانِ آزادی ایک جلوس کی صورت میں رواں دواں ہے اور:

عجوزہ سومنات کے اس جلوس میں ہیں

عقیم صدیوں کا علم لادے ہوئے برہمن

جو اک نئے سامراج کے خواب دیکھتے ہیں
اور اپنی توندوں کے بل پہ چلتے ہوئے مہاجن
حصولِ دولت کی آرزو میں بہ جبرعریاں
جو سامری کے فسوں کی قاتل حشیش پی کر
ہیں رہگذاروں میں آج پاکوب و مست و غلطاں
دف و دہل کی صدائے دلدوز پر خروشاں!
کسی جزیرے کی کور وادی کے
وحشیوں سے بھی بڑھ کے وحشی

کہ اُن کے ہونٹوں سے خوں کی رالیں ٹپک رہی ہیں
اور اُن کے سینوں پہ کاسہ سر لٹک رہے ہیں
جو بن کے تاریخ کی زبانیں
سنارہے ہیں فسانہ صد ہزارِ انساں!
اور اُن کے پیچھے لڑھکتے لنگڑاتے آرہے ہیں
کچھ اشتر اکی،
کچھ اُن کے احساں شناس مولا
بجھا چکے ہیں جو اپنے سینے کی شمع ایقاں!

یہ جلوس گویا برصغیر میں بسنے والی تمام قوموں کی آزادی کی بجائے ایک تازہ ترغلائی کی جانب پیش رفت سے عبارت ہے۔ ہر چند برہمنیت کی استحصالی روح نے فرنگی سامراج کے جدید قالب میں ڈھل کر خود کو پُر فریب اور خوش آہنگ نعروں میں چھپا رکھا ہے تاہم مسلمان، اچھوت اور دھقان سومنات کی بڑھیا کے اس جلوس میں شامل ہونے سے انکاری ہیں اور اس نام نہاد کاروانِ آزادی کو اندیشہ ہائے دور دراز کے ساتھ دیکھ رہے ہیں:

مگر سر راہ تک رہے ہیں
 کبھی تو دہشت زدہ نگاہوں سے
 اور کبھی یاس جاں گزاسے
 غریب و افسردہ دل مسلمان
 جو سوچتے ہیں
 کہ ”اے خدا
 آج اپنے آبا کی سر زمین میں
 ہم اجنبی ہیں،

ہدف ہیں نفرت کے ناوک تیز و جاں ستاں کے!“

مسلمانوں کو مٹا ڈالنے یا ہندوستان سے باہر دھکیل دینے کی علمبردار خدھی اور سنگھٹن
 کی تحریکوں سے لے کر پنڈت نہرو اور مہاتما گاندھی کے مسلمانوں کو مسلمانان ہند و مزاج بنادینے
 کے منصوبوں تک کتنے ہی بھیانک حقائق درج بالا مصرعوں سے جھانک رہے ہیں؟ اپنے ہی وطن
 میں اجنبی ہو کر رہ جانے کا احساس اگر مسلمانوں کو دہشت زدہ کیے دے رہا ہے تو اچھوتوں کو ہزار ہا
 برس پر پھیلے ہوئے ماضی کے مصائب یاد دلارہا ہے:

منو کے آئیں کا ظلم سہتے ہوئے ہریجن
 کہ جن کا سایہ بھی برہمن کے لیے
 ہے دُز و شبِ زمستاں
 وہ سوچتے ہیں!
 ”کہیں یہ ممکن ہے

بیچ ڈالے گا
 ہم کو بردہ فروش افرنگ

اب اُسی برہمن کے ہاتھوں
 کہ جس کے صدیوں پرانے سیسے سے
 آج بھی کور و کر ہیں سب ہم
 جواب بھی چاہے
 تو روک لے ہم سے نورِ عرفاں!“

اچھوت (ہریجن، دلت) اس دہشت سے کانپ رہا ہے کہ آدم فروشی کے کاروبار میں
 مصروف فرنگی ہم کو پھر سے اُسی برہمن کے ہاتھ بیچ ڈالنے کا بھیانک کھیل کھیلنے میں مصروف ہے
 جس نے ہمارے کانوں میں بگھلا ہوا سیسہ انڈیل کر ہمیں صدیوں سے اندھا اور بہرا کر رکھا ہے
 اور ہم پر علم و عرفان کے دروازے بند کر رکھے ہیں۔ اس جلوس کے مسلمان اور اچھوت تماشائیوں
 کے ساتھ مظلوم کسان بھی کھڑے اس تماشے کو بچوں کی سی حیرت کے ساتھ دیکھ رہے ہیں:

ستم رسیدہ نحیف دہقاں
 بھی اس تماشے کو تک رہا ہے
 اُسے خبر بھی نہیں کہ آقا بدل رہے ہیں
 وہ اس تماشے کو
 طفلِ کسن کی حیرتِ تابناک سے محض دیکھتا ہے!
 جلوس وحشی کی آڑ سے
 سب کو اپنی جانب بلارہا ہے
 کہ رتبہ سومات کی بارگاہ میں آ کے سر جھکاؤ!
 مگر وہ جس ازل
 جو حیواں کو بھی میسر ہے
 سب تماشائیوں سے کہتی ہے

”اس سے آگے اجل ہے

بس مرگ لم یزل ہے!“

اسی لئے وہ کنارِ جادہ پر ایستادہ ہیں، دیکھتے ہیں!

نظم اس امید پر ختم ہوتی ہے کہ تماشائی ہمیشہ یونہی خاموش تماشائی ہی نہ بنے رہیں گے بلکہ اس نئی سامراجی سازش کا پردہ چاک کر دیں گے:

نہیں، وہ ساعت قریب ہے

جب وہ ربیہ سومنات کے اس طلسم نازک کو

غزنوی بن کے نوچ ڈالیں گے

چاک کر دیں گے

وہم و بیداد و زپرستی کی سازش تازہ تر کا داماں!

(سومنات)

راشد کے اس صداقت پسندانہ تجزیے کی رُو سے فرنگی سامراج جاتے جاتے متحدہ ہندوستانی قومیت کے نام پر ایک ایسے نئے سامراج کی داغ بیل ڈالنے میں کوشاں تھا جو برصغیر کی تمام قوموں کو اپنی زنجیر میں اسیر کر سکے۔ ایسے میں راشد کی امیدیں مسلمان قوم سے وابستہ تھیں اور وہ سوچ رہے تھے کہ مسلمان اپنی جداگانہ قومی ہستی کے اثبات سے اس نئی سامراجی سازش کا پردہ چاک کر ڈالیں گے۔ ہندی مسلمان راشد کی توقعات پر پورا اترے اور قیام پاکستان سے انھوں نے برصغیر کی دیگر اقوام کے سامنے آزادی و خود مختاری کی راہیں روشن کر دیں۔

ایک ایسے زمانے میں جب جدیدیت کے دبستانِ ادب میں فن برائے فن کے نام پر ادب و فن کو مقصدیت کی ”آلائش“ سے پاک کر کے رکھ دینا سب سے بڑا کارنامہ فن اور ترقی پسند ادبی تحریک کے وابستگان کے نزدیک سوویت روس استعمار دشمن عوامیت کی سب سے بڑی مثال قرار پایا تھا، م راشد نے ہر دو دبستانوں کی ادبی سیاست سے انحراف کی راہ اپنائی۔ ہر چند

دونوں ادبی دبستانوں نے راشد کی شاعری کی تحسین میں بڑی فراخ دلی سے کام لیا۔ میراجی نے راشد کے دو راؤل کی متعدد نظموں پر تحسینی مضامین لکھے اور فیض نے راشد کے پہلے مجموعہ کلام ”ماورا“ کے دیباچے میں بڑی گرمجوشی کے ساتھ بزمِ ادب میں راشد کے طلوع کا خیر مقدم کیا مگر اس کے باوجود راشد کی انفرادیت نے ان دو میں سے کسی بھی غالب دبستانِ ادب کی چاکری گوارا نہ کی۔ تہذیب، معاشرت اور ادب و فن پر سیاست کے اثرات اُن کی شاعری کا مرکزی موضوع بنے رہے۔ اس باب میں بھی وہ اپنے ترقی پسند ساتھیوں کی طرح صرف مغربی سامراج تک محدود نہ رہے بلکہ انھوں نے اس کے ساتھ ساتھ سوویت سامراج اور برہمن سامراج کو بھی اپنی انسان دوست اور سامراج دشمن شاعری کا موضوع بنایا۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو راشد اپنے دور کے سب سے بڑے سامراج دشمن شاعر اور دانشور قرار پائیں گے۔

(1) SAVUSHUN, 1990, Mage Publishers Washington, D.C., page 11